

آشیانه

05-04-2017



فہرست

صحت

۱. ماحولیاتی آلودگی کا شکار بچے.....

ادب و مزاح

۲. اکرم سہیل اور عصری تاریخ.....

سائنس / ٹیکنالوجی

۴. پولیٹھین بیگز ، ایک خاموش قاتل.....

۷. جنگلات کی معاشی ، ماحولیاتی اہمیت!.....

۹. شوگر مافیا کا عروج اور کپاس کا زوال.....

مشہور شخصیات

۱۰. اردو ادب کا ایک نام۔ ابن انشاء.....

معاشرہ اور ثقافت

۱۱. اپریل فول ، جھوٹ کا عالمی دن!.....

ماحولیاتی آلودگی کا شکار بچے

مصنف: حاجی بصیر سراج



۵۷۰۰۰۰ پانچ لاکھ ستر ہزار بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں ہر سال سانس کی بیماریوں کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں جو کہ فضائی آلودگی اور سگریٹ کے دھوئیں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

۳۶۱۰۰۰ تین لاکھ اسی ہزار بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں صاف پانی تک عدم رسائی، سینی ٹیشن کے نظام کی خرابی اور حفظان صحت کے اصولوں پہ عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہیضہ کا شکار ہوتے ہیں جس کی وجہ ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

۲۷۰۰۰ دو لاکھ ستر ہزار وہ بچے ہیں جو اپنی عمر کے لپٹرائی مہینہ میں حفظان صحت کے فقدان، گندے پانی اور فضائی آلودگی کی بدولت اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ مٹھتے ہیں۔

۲۰۰۰۰۰ دو لاکھ بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہے لیبریا کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں ان کی زندگی کو بچایا جا سکتا ہے اگر ماحول کی صفائی کی جائے اور پھجروں کا تدارک کیا جائے۔

۲۰۰۰۰۰ دو لاکھ بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہیں، وہ انجانے میں زخمی ہوتے ہیں مثلاً زہر خورانی، گرنا اور پانی میں ڈوبنا وغیرہ۔

اوپر دیئے گئے اعداد و شمار اگرچہ کہ پوری دنیا سے لئے گئے لیکن اس تناظر میں آج ہم اپنے حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں، کہ ہم ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے کس قدر احتیاط برت رہے ہیں، فضائی آلودگی کے حوالے سے عالمی رپورٹیں ہمارے ملک کے بڑے شہروں کے بارے جاری ہوتی رہتی ہیں کہ کس قدر آلودگی بڑھ رہی ہے، ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق کراچی کی فضا میں آلودگی کی تہہ کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، اس کے علاوہ کراچی ہی کی میڈیا رپورٹس موجود ہیں کہ اکثریتی آبادی آلودہ پانی پینے پہ مجبور ہے۔ یہ صورتحال پاکستان کے تمام بڑے اور چھوٹے شہروں کی ہے، بڑی بڑی آبپاشیاں گٹر وں سے آلودہ پانی پیتی ہیں، فضائی آلودگی کا حال یہ ہے کہ نہ ٹریفک کا نظام فعال ہے جو کہ دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں کا تدارک کرے اور نہ ہی فیکٹریوں اور ملوں کے دھوئیں اور دیگر ویسٹ کو مناسب طریقے سے ٹھکانے لگانے کا کوئی عملی اور فعال نظام موجود ہے، اور مزید یہ کہ سب سے بری حالت سالڈ ویسٹ کے نظام کی ہے یا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ملک کے کسی بھی حصے میں قابل ستائش سالڈ ویسٹ سسٹم موجود نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ہسپتال سانس، معدے، کینسر، گردے، دل کی بیماریوں کے مریضوں سے اٹے پڑے ہیں۔ اور خاص طور پہ بچوں کی اموات ہو رہی ہیں۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ حکومتی سطح پہ ہنگامی فیبادوں پہ کام ہونا چاہئے، خاص طور پہ بلدیاتی نظام کو فعال اور منظم کرنے کی ضرورت ہے اور اس نظام سے کپٹ اور کالی بھیڑوں کو نکالنے کی ضرورت ہے تاکہ بہتر لوگ آگے آئیں اور ایک منظم سینی ٹیشن، پینے کے صاف پانی، سالڈ ویسٹ میجمنٹ، ٹائون پلاننگ کے ذریعے ماحولیاتی آلودگی سے ملک کو پاک کرنے میں کردار ادا کریں اور اس کے علاوہ ہر فرد معاشرہ پہ انفرای سطح پہ بھی یہ اولین ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بھی ماحول کو صاف کرنے میں اپنا کردار ادا کرے مثلاً سگریٹ نوشی، سے اجتناب لگی و محلے میں کھلی جگہوں پہ کوڑا کرکٹ بھینکنے کی عادت کو ختم کرنا، اپنے گلی اور گھر کی سیوریج کے نظام کو بہتر بنانا، کھلی نالیوں کو بند کرنا اور حفظان صحت کے اصولوں پہ نہ صرف خود عمل کرنا بلکہ خاص طور پہ بچوں کی تربیت کرنا۔ اس حوالے سے خاص طور سکولوں اور کالجوں کی سطح پہ تربیت کا نصاب ترتیب دینا نیز پبلک کی آگاہی کے لئے مہمات اور اس سلسلے میں حکومتی اداروں کے شانہ بشانہ اپنا حصہ ڈالیں۔ یقیناً اجتماعی کوششوں سے ہی اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔

§§§

عالمی ادارہ صحت کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں بچوں کا مستقبل ان کی صحت کے حوالے سے انتہائی خطرے سے دو چار ہے، اس کی وجہ ماحولیاتی آلودگی بتائی گئی ہے۔ اس آلودگی کی وجہ سے ایک اعشاریہ سات ملین بچے ہر سال دنیا بھر میں موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ بچوں کی ہر چار اموات میں سے ایک یا اس سے زیادہ غیر حتمندانہ ماحول کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہر سال ماحولیاتی خطرات جن کا تعلق اندرون یا بیرون سے ہوتا ہے جن میں فضائی آلودگی، دھوئیں کی وجہ سے آلودگی، مضر صحت پانی، غیر مناسب سیوریج کا نظام یا سیوریج کے نظام کی عدم دستیابی اور حفظان صحت کے نظام کی خرابی کی وجہ ہر سال سے ایک اعشاریہ سات ملین بچے جن کی عمریں پانچ سال سے کم ہوتی ہے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

عالمی ادارہ صحت کی دو مزید نئی رپورٹیں بھی منظر عام پہ آئیں جن میں ایک رپورٹ: Inheriting a Sustainable World کے مطابق ایک ماہ سے پانچ سال کے بچوں کی موت کی وجہ ہیضہ، تلیہ یا اور نمونہ ہیں، جن کا تدارک ماحولیاتی خطرات کو کم کر کے کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ صاف پانی کا حصول، پکانے کے لئے صاف ایندھن کی دستیابی، عالمی ادارہ صحت کی ڈائریکٹر جنرل Dr Margaret Chan کا کہنا ہے، آلودہ ماحول خاص طور پہ بچوں کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ ان کے بڑھتے ہوئے اعضاء، کمزور مدافعتی نظام اور ان کی چھوٹے جسم اور ہوا کے راستے انہیں گندے پانی آلودہ ہوا سے غیر محفوظ بناتے ہیں، ان خطرات کا آغاز ماں کے پیٹ سے شروع ہوتا ہے اور قبل از وقت پیدائش کے خطرات کو بڑھاتا ہے۔ مزید یہ کہ جب اندرون خانہ یا بیرون جب شیر خوار اور سکول جانے سے پہلے کی عمر کے بچے ہوائی آلودگی اور سگریٹ کے دھواں سے متاثر ہوتے ہیں تو ان میں نمونیہ کے خطرات بڑھ جاتے ہیں اس کے علاوہ ہوائی آلودگی میں رہنے کی وجہ سے دل کی بیماریوں، کینسر کا بھی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پانچ بڑی وجوہات جن کا تعلق بچوں کی اموات سے ہے ان کا تعلق ماحولیات سے ہے۔

ایک اور رپورٹ: A companion report, Don't pollute my future! The impact of the environment on children's health نے جامع جائزہ پیش کیا ہے جس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

اکرم سہیل اور عصری تاریخ

مصنف: علی احمد

کہتے ہیں کہ ایک بار اشرف صہجی کسی کام سے حفیظ جالندھری کے گھر گئے۔ وہاں انہوں نے حفیظ جالندھری سے کوئی کتاب طلب کی جو کسی الماری میں تالا بند تھی۔ حفیظ جالندھری صاحب نے پیٹھے پیٹھے ہانک لگائی۔۔۔ پیگم ذرا چابی دینا، ایک کتاب نکالنی ہے۔ اس پر صہجی چپک کر بولے "ہاں ہاں ضرور چابی دیجیے یہ بھی اب چابی کھلونا بن گئے ہیں۔ چابی کے بغیر چل نہیں سکتے"

یہ تو گئے زمانوں کی بات ہے جب ٹیکنالوجی ذرا کم ترقی یافتہ تھی اور ان دنوں مارکیٹ پر جاپان چھایا ہوا تھا۔ اب معاملہ ذرا اور آگے بڑھ گیا ہے۔ ایک طرف چین کا سایہ ہے تو دوسری طرف ریوٹ کا دور دورہ۔ اسلئے اب ہمیں ہم تم کرے میں بند ہوں اور چابی کھو دیں جیسے گیت سننے کو نہیں ملتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اب "ٹچ" سسٹم چل رہا ہے۔ سو اب "ٹچ می ناٹ" بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں تو صہجی کا ٹھٹھا اپنی جگہ مگر یہ حقیقت ہے کہ اب عمومی طور پر سوچ و عمل کے باب میں کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ صاف نظر آتا ہے کہ ریوٹ کہیں اور ہے حرکت کہیں اور۔۔۔ اس بے حس و جامد کیفیت میں کچھ فرزانے بلکہ دیوانے ایسے ہوتے ہیں جو "کل جاسم سم" کا اسم اعظم الاپتے سناتے دوڑتے بھاگتے پھرتے ہیں۔ کہ شاید کہیں کوئی جنبش ہو اور کوئی روک بندش کھلے۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ جو کہنے کو کئی سال بیوروکریسی میں گزارا بلکہ گنوا کر آیا ہے۔ لیکن ایسا کلاما "نیا" کہ برسوں پہلے دیکھے خواب سنبھالے پھرتا ہے۔ اسے گمان ہے کہ اس کے خواب نئے اجالوں کے سفیر ہیں۔ اس کا گمان وقت کے ساتھ ساتھ ایقان میں بدلا سو وہ کہنے کے قابل ہوا۔

میں وہ جانتا ہوں حقیقتیں جو اس ارض بے نوا کی ہیں گر دل میں رکھ کے ہی سو گیا تمہیں کون پھر یہ بتائے گا اس نے اپنے خوابوں کا انتساب کچھ ایسا کیا کہ سب ظاہر باہر ہو گیا۔ مشہور پہاڑی آخان ہے کہ "ہمنیاں ناں بالا نیدی اے اپنا" اس کی فکر و شاعری کے باب میں یہ آخان مکمل طور پر صادق آتا ہے کہ اس کا حرف حرف لفظ لفظ اس کی سوچ کا آئینہ دار ہے۔

وہ "حم" لکھتا ہے تو کہتا ہے کسی نے لو جو لگائی تو اس کو دار ملی کہیں تو نوک سناں تن کے آر پار ملی وہ تیرے نام کا صدقہ اتارنے کے لئے دیا تھا دل تو چلے جان وارنے کے لئے اور "نعت" کے تو یوں گویا ہوتا ہے۔ قاطع عہد غلامی وہ بشیر اور نذیر عہد ظلمات میں وہ شمس الضحیٰ کی تنویر ظلم کا ہاتھ جھٹک دینے کی توفیق ملی بند سوچوں کو بھی پھر جرات تحقیق ملی غالباً

اسی متبرک سوتے سے تحقیق و تخلیق کی جرات پا کر جب وہ آگے بڑھتا ہے تو اس کا اسم اعظم کام کر جاتا ہے۔ وہ کل جا سم سم کہتا ہے تو ملکی حالات، تاریخ، تحریک اور سیاست کے بند در اس کے سامنے کچھ یوں داہوتے ہیں کہ وہ سات پردوں میں ہونے والے معاملات کو بھی دیکھ سمجھ لیتا ہے۔ اس کی پرکھ کی یہ صلاحیت دیکھ کر کبھی کبھی وہ مجھے "حکلیت" کے صابر راجپوت کی کہانیوں کا "کھوجی" لگتا ہے جو کھرا اٹھتا ہے، تو ملکی وسائل لوٹنے والوں کے گھرنیک پھپھتا ہے۔ وہ اس سمجھ بوجھ کو جب اپنی اہلیت اور فنی ریاضت کے سہارے شاعری کا چیرھن پہناتا ہے تو وہ سنور کھنکھ کر یوں سامنے آجاتی ہے کہ سیاہ اندھیرے میں چاندنی سی چمک چمک بن جاتی ہے۔

وہ فکری طور پر راسخ ہے سو اسے کر بلا حریت کا استعارہ لگتا ہے اور اسے یہ جرات بھی حاصل ہے کہ وہ فیض سے پوچھ پائے کہ "کب راج کرے کی خلق خدا" حریت اور فیض کا تذکرہ آیا تو یہ کہنا حق بنتا ہے کہ وہ ترقی پسند فکر کا حامل شخص و شاعر ہے اسی لئے اس کی شاعری میں مزاحمت کا عنصر بہت واضح ہے اور وہ جرات و ہمت کو رہبر کر کے خلق خدا کی حالت بدلنے کی آس رکھتا ہے۔ وہ شہر کے قلم کاروں کو حرمت لفظ کا اٹن بتاتا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ "جی روح اوہے بے فرشتے" یعنی جیسا تو ویسے حکمران باہ۔

! ائن انشا کہنا ہے کہ حق اچھا پر اس کے لئے کوئی اور مرے تو اور اچھا سو ہم بحیثیت مجموعی وہ محتاط و منافع لوگ ہیں جو ہر سو ظلم کی پلاشتاں دیکھ کر اسے غلط تک کہنے سوچنے سے بھی گریزاں ہیں کہ مبادا یوں نہ ہو جائے مبادا وہ نہ ہو جائے۔ اس کی شاعری کا مطالعہ بتایا ہے کہ وہ اس "احتیاط" سے ممکنہ طور پر بچا رہا ہے۔ اور اس کی یہ عادت اس کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ لہذا اس کا لکھا حرف حرف لفظ، شعر، نظم، قطعہ، غزل سبھی کچھ ایک خاص فکر کا غماز ہے۔ وہ اب برائے زندگی کا قائل بلکہ اس سے گھماں ہے۔ سو اس کے سارے موضوعات زندگی بلکہ کرب انگیز زندگی سے کشید ہوئے ہیں۔ اسلئے اس کی شاعری میں صداقت بھی ہے اور بغاوت بھی۔ وہ جانتا ہے کہ "حکم شامی" یوں ہی ملتا ہے۔

حکم شامی ہے مرا جشن منایا جائے میرے ارمانوں کا ایک تخت بچھایا جائے میرے احکام کی تعمیل مگر ہو ایسے سی سختی کسی کاغذ پہ نہ لایا جائے ایسی بستی کہ جہاں لوگ ہوں گستاخ بہت ایسا گھر کوچ و بازار جلایا جائے * وہ بھی کچھ ایسا ہی "گستاخ" ہے مگر اس نے ہر بات نہایت سجود پنے سے کہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی فکر عمومی طور پر اس کے بیان کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔

یوں تو "نئے اجالے ہیں خواب میرے"۔۔۔ دس حصوں پر مشتمل ہے اور اس کے تمام حصے ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ اس کا موضوع مظلوم ملک و لوگ ہیں اور مظلوموں

کے درد سانچے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان فطری اتحاد ہونا بھی لازمی امر ہے لیکن اس کے دو خصوصی حصے جو کشمیریات یعنی کشمیر کی تحریک آزادی اور یہاں کے قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ کا احوال بیان کرتے ہیں، خاصے کی چیز ہیں۔

کہتے ہیں کہ افغانستان کے جہاد اور روس کے سقوط کا اصل سبب کسٹین میں پایا جانے والا سنہری سیال ہے۔ اس طرح ماہرین کہتے ہیں کہ دنیا میں آئندہ جنگیں پانیوں پر ہوں گی۔ ان دو حوالوں کو ذہن میں رکھ کر دیکھا جائے تو گزشتہ کئی سالوں سے کشمیر کی مایلوں اور نالوں پر قبضے کا ایک خاموش عمل آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ عمل وہ ہے جسے اس نے "وائر لائڈرنگ" کا نام دیا ہے۔ اس نے پہلی بار اس اہم اور بے حد حساس معاملے کو دیکھا اس پر سوچا اور پھر پوری جرات سے لکھا۔ یوں مجھے اس کی شاعری کشمیر کی عصری تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ اس عصری تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو مجھے شعوری طور پر یہ عمل ایک نئے کشمیر کی دریافت لگتا ہے۔

اکرم سہیل کی شاعری میں نظم و قطعے کا پلا ذرا بھاری ہے۔ اس کی نظم ہنگامی و موضوعاتی نوعیت کی ہے۔ یوں وہ مولانا ظفر علی خان کی راہ کا راہی کہلا سکتا ہے۔ لیکن بلند آہنگی اور پر شکوہ انداز کے باعث اور غالباً فطری میلان میں یکسانیت کے سبب وہ غیر محسوس انداز میں جوش کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔ اس کی نظم و قطعے کا باہم مطالعہ گزشتہ دو تین دہائیوں کی تاریخ کے وہ در واکرتا ہے جو عمومی طور پر ڈاڈے باٹے کر کے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

اپنی طبیعت اور شخصیت میں وہ حلیم و متوازن شخص فیض اور احمد ندیم قاسمی کا مقلد لگتا ہے۔ فیض جو اب برائے زندگی کے قافلے کا سرخیل تھے کہ متعلق کتابوں میں پڑھا اور لوگوں سے سنا ہے کہ وہ علم، حلم اور نظم کا آمیزہ تھے تو اسی طرح رب کی مہربانی سے کھلی آنکھوں سے ندیم کو بار بار دیکھا تو یہ جانتا کہ فنی ہنرمند اور سلیقہ شعاری کیا ہوتا ہے۔ اکرم سہیل شخصی حوالوں سے ان سے متاثر لگتے ہیں لیکن مزاحمتی شاعری میں ان پر غالب ذرا زیادہ غالب نظر آتے ہیں۔ شاید حالات کی سختی اور تلخی نے ان کے لہجے کو ذرا تند کر دیا ہے، ورنہ یوں تو وہ ریلے ٹپھے شخص ہیں۔

اکرم سہیل جب کشمیر کہانی کہتے ہیں تو وہ یہاں کے بہتے پانی کو نہیں بھول پاتے جو ہائیزل جزیرہ کی نیچاری کی صورت میں دے دیا گیا، اسی لئے ان کا کہنا ہے۔

نالہ صدیوں سے ہے دلگیر میرا جسم بھی پایہ زنجیر میرا جس کے پانی پہ میرا حق ہی نہیں کیسے کشمیر و کشمیر میرا مسئلہ کشمیر پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کیا رخ بھی یہ دیکھا ہے کشمیر کہانی کا باقی ہیں یہ سب نعرے مسئلہ ہے یہ پانی کا یا پھر میری دھرتی کی ایک ہی دولت ہوس زر کا وہی شکار ہوئی کیسے قبضے میں غیر کے آئی یہ حقیقت بھی

آشکار ہوئی اکرم سہیل نے کشمیر کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کو پہلی بار موضوع شاعری بنایا۔ سو وہ کہتے ہیں۔

میرے دریاؤں کی باتیں ، میرے اشجار کی باتیں میرے یا قوت کی باتیں، میرے مرجان کی باتیں جو ہو قومی وسائل لوٹا مقصد ہی جب ان کا کہاں بھاتی ہیں ان کو قاعدہ قانون کی باتیں اکرم سہیل کی شاعری یقیناً کشمیر کے مزاحمتی ادب میں ایک بامعنی اضافہ ہے۔ جس کی گونج نہیں جلتی رنگ دور اور دیر تک سنائی دے گی۔ کہ اس میں کشمیر کے بہتے جھرنوں اور گنگناتی ندیوں کا ترنم و الم ہے اور اس کی تاثیر یقیناً گہری اور ڈاڈی ہے۔ کہ یہ دھرتی کے سینے پر رقم وہ تحریر ہے جسے محسوس کئے بنا آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔

§§§

پولیتھین بگزر ، ایک خاموش قاتل

مصنف: حاجی بصیر سراج

کے شاپر بگیوں نے پاکستان میں ماحول کو آلودہ کیا ہوا ہے، گٹر بند ہو رہے ہیں، نالیاں شاہ بیک اور چپس کے بگیوں سے اٹی پڑی ہیں۔ کوڑے کیساتھ انہیں جلانے سے بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں درجن بھر فیکٹریاں ہیں جو کہ پلاسٹک بگزر بناتی ہیں جو کہ کروڑوں بیک روزانہ کی بنیاد پر بنا کر بیچ رہی ہیں۔



پلاسٹک ایک پولیمر ہے جو کہ ایک یا مختلف کیمیائی اجزاء سے مل کر تیار کیا جاتا ہے۔ پلاسٹک کی عموماً دو اقسام استعمال کی جاتی ہیں، جن میں سے ایک قدرتی ہے، جو درختوں اور جانوروں سے حاصل کیا جاتا ہے، جبکہ پلاسٹک کی دوسری قسم لیبارٹری یا فیکٹری میں تیار کی جاتی ہے۔ قدرتی پولیمر کی پہلی قسم کے دائرے میں نشاستہ یا اسٹارچ اور سیلولوس، جبکہ دوسری قسم میں پروٹین شامل ہے، جس میں لکڑی، ریشم، چمڑا وغیرہ آتے ہیں۔ قدرتی پولیمر کی تیسری وہ قسم ہے جس میں ڈی این اے اور آر این اے آتے ہیں، جو ہمارے نشوونما کے ضامن ہیں مصنوعی پولیمر دراصل لیبارٹریز میں تیار کیا جانے والا پلاسٹک ہے۔ اس کی عام اقسام میں پولی تھین، پولی اسٹیرین، سینتھٹک ربڑ، نائیلون، پی وی سی، بیکولائٹ، میلامائن، ٹیٹلون اور آزلون وغیرہ شامل ہیں۔ پولی تھین دراصل ایک سیال مادہ ہے جسے آبائی کسی بھی شکل و صورت میں ڈھالا جاسکتا ہے اور کسی بھی رنگ میں رنگا جاسکتا ہے، جبکہ اسے نرمی اور ملائمت کی کسی بھی حد تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اسی خصوصیت نے اسے انتہائی سستے پولی تھین لفافوں، بیک اور دیگر کارآمد اشیاء کی تیاری میں مقبول عام بنایا ہے۔ پولی تھین یا پلاسٹک کا استعمال اب ہماری روزمرہ زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکا ہے اور یہ استعمال دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ یوں تو پولی تھین کا استعمال ناگزیر بن چکا ہے، لیکن اسے استعمال کرنے کے بعد یونہی چھینک دینے کا سوال کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے خطے میں لوگ تو پولی تھین سے بنے لفافے اور تھیلے استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہمارے یہاں ان اشیاء کو استعمال کرنے کے بعد صحیح ڈھنگ سے ضائع کرنے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ ان

لفافوں اور تھیلوں کو بلا تردد گلی کوچوں، سڑکوں، نالیوں، دریاؤں اور باغیچوں، حتیٰ کہ اپنے گھروں کے صحن میں بھی بغیر سوچے سمجھے پھینک دیا جاتا ہے اور یہی لاپرواہی ہمارے ماحول کی آلودگی کا سب سے بڑا سبب بن چکی ہے۔ عام استعمال میں آنے والا پولی تھین اگرچہ ہمارا سستا دوست ہے لیکن ہماری ناسمجھی اور غفلت کی وجہ سے یہی سستا دوست ہمارا سب سے بڑا دشمن بنتا جا رہا ہے۔ ماحول کو متوازی رکھنے کے بارے میں ہماری بے حسی اور لاعلمی کے باعث پولی تھین کی استعمال شدہ اشیاء گلیوں، نالیوں، دریاؤں اور جمیلوں میں اپنا مسکن بنالیتی ہیں، جو پانی کی نکاسی کے نظام کو درہم برہم کرنے اور خطرناک صورتحال پیدا کرنے کا ذمہ دار بنتا ہے۔ ملک کے مختلف شہری علاقوں میں پولی تھین سے نالیوں اور سیوریج کا بند ہونا ایک وبا بن چکی ہے۔ گندے پانی کے نکاس بند ہونے کے نتیجے میں تمام قریبی علاقوں میں بدبو، گندگی اور مختلف بیماریوں کو دعوت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ برسات کے موسم کی ذرا سی بارش بھی ایک سیلاب کا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ دوسری جانب ہمارے آبی ذخائر پولی تھین لفافوں کی آماجگاہ بن رہے ہیں جن سے آبی حیات کا بری طرح متاثر ہونا لازمی بات ہے۔ پاکستان کی متعدد جمیلوں اور دریاؤں میں پولی تھین سے بنائی گئی بے شمار اشیاء کو تیرتے، بہتے اور جمع ہوتے دیکھا جاسکتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پاکستان کے پرفضاء پہاڑی علاقوں میں بھی پولی تھین اپنے برے اثرات پھیلا چکا ہے اور وہاں کی صاف ستھری آب و ہوا اور ماحول کو بھی متاثر کرنے میں مصروف عمل ہے۔ پولی تھین کا استعمال ہماری بے احتیاطی کی وجہ سے جتنا عام ہوگا، اتنا ہی ہمارا ماحول بھی اس کے مضر اثرات سے متاثر ہوتا چلا جائے گا۔

پولی تھین چونکہ ایک نہ سڑنے والی شے ہے، اس لئے یہ زمین کی ساخت اور زرخیزی کو بری طرح تھس نہیں کر دیتی ہے۔ آسان الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ پولی تھین زمین کی سانس کو بند کر کے اس کو خنجر کر دیتا ہے اور نباتات کو زمین سے جو غذا اور دوسرے اجزاء ملنے چاہئیں ان کی ترسیل میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں نباتات کی افزائش رک جاتی ہے اور زمین کی پیداواری صلاحیت بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ اگر بغور مشاہدہ کیا جائے تو بارش کا پانی پولی تھین کی وجہ سے زمین کے اندر جذب نہیں ہوتا۔ اسی لئے ہمارے جنگلات بھی بری طرح سے متاثر ہوتے ہیں اور اکثر علاقوں کے جنگلات اور زرعی زمینیں پولی تھین کی وجہ سے اپنی ساخت اور صلاحیت کھو دیتی ہے، اور ہماری پیداوار کھتی چلی جاتی ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ سڑکوں، گلی کوچوں، نالیوں اور کھلی جگہوں پر پھینکے گئے پولی تھین بگزر ہمارے موبٹی بھی کھالیتے ہیں جو ان کیلئے جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حال ہی میں ایک ویٹرنری ہسپتال میں جب ایک بیمار گائے کا آپریشن کیا گیا تو اس کے پیٹ سے کئی کلو وزنی پولی تھین کے بگزر نکلے۔ اس کے علاوہ ایک تحقیقاتی

پاکستان میں پلاسٹک کے بنے ہوئے شاہ بگزر جنہیں پولی تھین بگزر کہا جاتا ہے۔ پولی تھین بگزر آنے سے قبل جب لوگ گھر کا سودا یا سامان لینے کے لئے بازار جاتے تھے تو اپنے ساتھ کپڑے کا تھیلہ یا کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ٹوکری لے کر گھر سے نکلتے تھے۔ کپڑے کے تھیلے مارکیٹ میں سلعے سلائے بھی ملتے تھے اور خواتین گھروں میں خود بھی سی لیتی تھیں۔ مگر آج آپ بازار کو رخ کریں تو آپ یہ دیکھ کر حیران نہیں ہو گئے کہ ہر سودا سلف خریدنے والا ہاتھ پولی تھین بگزر سے بھرا ہوا دکھائی دے گا، ایک پاؤ کیلوں سے لے کر کپڑوں تک ہر چیز آپ کو پولی تھین بگزر میں ملے گی۔ چونکہ پلاسٹک جدید کیمیائی صنعت میں بہت ہی سستی اور عام شے ہے جو ہماری زندگی میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ پلاسٹک کو آج ہمارے یہاں اس قدر اہمیت حاصل ہو چکی ہے کہ اس کے بغیر اب روزمرہ زندگی ادھوری لگتی ہے۔ ہم روزانہ پلاسٹک سے بنائی گئی کوئی نہ کوئی چیز ضرور استعمال کرتے ہیں، جبکہ پلاسٹک کا سب سے زیادہ استعمال ہم پولی تھین لفافوں یا بگزر کی صورت میں کرتے ہیں۔ یہ بیک یا لفافے وزن میں انتہائی ہلکے اور سستے ہوتے ہیں اور ہم انہیں کسی بھی طرح سے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان ہی فائدوں کو دیکھ کر ہم ان کا بکثرت استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کے مضر اثرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان پلاسٹک بگزر کو استعمال کے بعد پھینک دیا جاتا ہے، لیکن یہ اپنی کیمیائی خصوصیات کے باعث مٹی، پانی یا ہوا میں گئے سڑنے کے بجائے ہمارے ماحول کیلئے مضر اور ضرر رساں بن جاتے ہیں۔ پاکستان میں ایک اندازے کے مطابق روزانہ 15 سے 29 کروڑ پلاسٹک بگزر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ 2004 میں کئے گئے سروے میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ 2015 میں پاکستان میں پلاسٹک بگزر کا سالانہ استعمال 122 ملین تک پہنچ جائے گا۔ اگر اس تعداد کو روزانہ کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے تو تقریباً پاکستان کی آبادی پر ایک پلاسٹک بیک فی کس روزانہ آتا ہے۔ 1965 میں سویڈن کی ایک کمپنی نے پولی تھین بگزر کو متعارف کرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ دنیا میں عام ہو گیا اور پاکستان میں پلاسٹک کے شاپر بگزر 80 کی دہائی میں شروع ہوئے اور پھر پورے پاکستان میں مشہور ہو گئے۔ اب تو دودھ اور دہی تک پولی تھین کے لفافوں میں بیچا جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے کھجور کی ٹوکریوں کو ختم کر دیا اور پولی تھین کی آمد نے کاغذی لفافوں کی مارکیٹ ختم کر دی۔ اب پولی تھین

نیم نے ایک مردہ گائے کا آپریشن کر کے اس کے پیٹ سے 40 کلو گرام پلاسٹک بیگز نکالے۔ اس طرح نہ جانے کتنے ہی مویشی پلاسٹک اور پولی تھین کھا کر زندگی کی بازی ہار چکے ہوں گے۔ دوسری جانب پولی تھین بیگز میں استعمال کئے جانے والے رنگ بھی مضر صحت ہوتے ہیں، جن کے برے اثرات ہماری صحت کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اگر ان لفافوں اور بیگز کو جلا یا جائے تو ان کا دھواں ہوا کو زہر آلودہ کر دیتا ہے۔ یہ دھواں ہماری آنکھوں، جلد اور نظام تنفس پر بری طرح سے اثر انداز ہوتا ہے اور یہی دھواں سردرد کا موجب بھی بنتا ہے جو کہ جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ پلاسٹک اور پولی تھین اپنے ضرر رساں، مضر صحت اور انتہائی نقصان دہ اثرات سے انسانی زندگی، حیوانات و نباتات، چرند پرند اور ہمارے پورے ماحول کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کرتا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں تو پلاسٹک کے تھیلوں کے استعمال پر پابندی لگائی جا چکی ہے اور کئی ممالک پابندی لگانے پر غور کر رہے ہیں۔ پلاسٹک کے تھیلے یا پولی تھین بیگ کو عالمی سطح پر ناقابل استعمال قرار دیا جا چکا ہے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ہم کئی بیماریوں اور مسائل کا شکار ہو رہے ہیں لیکن اسکا متبادل ذریعہ دریافت نہ کرنے کی وجہ سے اب یہ ہمارے معاشرے کا لازمی جز بن چکا ہے۔ چین میں پلاسٹک بیگز کے لیے الگ سے پیسے دینے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے پلاسٹک بیگز کے استعمال میں نمایاں کمی آئی ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق یہ تھیلیاں گلنے کے لئے اگر مٹی میں دی ہو تو کم از کم ایک ہزار سال اور اگر پانی میں پڑے رہے تو تقریباً 4500 سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ اپنی ان منفی خصوصیات کی وجہ سے پولی تھین بیگز پوری دنیا کے ماحول کی لئے سنگین خطرہ ثابت ہو رہے ہیں۔ وزن میں ہلکا ہونے کے باعث یہ بیگز ہوا کے ساتھ اڑتے رہتے ہیں اور نالیوں اور سیوریج سسٹم تک پہنچ کر اسے بند کر دیتے ہیں۔ ان بیگز سے ماحول کے نقصان کو بچانے کے لئے سمجھدار قوموں نے شاپنگ بیگز کے استعمال پر پابندی عائد کر دی ہے اور کئی ملکوں میں دکان داروں کو پابند کیا گیا ہے اس کا متبادل تلاش کر لیں۔ بنگلہ دیش میں 1988 اور 1998 میں آنے والا تباہ کن سیلاب کا ایک اہم سبب ان بیگز کو قرار دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ملک کا ڈریج سسٹم فیل ہو گیا اور سیلابی کیفیت پیدا ہو گئی۔

ماحول کو صاف ستھرا رکھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ماحول کی آلودگی کے برے اور تباہ کن اثرات سے عوام کو باخبر نہ کیا جائے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اشیائے ضرورت لانے لیجانے کیلئے کپڑے، پٹ سن اور کاغذ کے تھیلوں اور لفافوں کے استعمال کو عام کیا جائے۔ ایسی اشیاء کی تیاری اور انہیں عوام میں مقبول بنانے کیلئے ہر سطح پر حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ حکومتی سطح پر پلاسٹک اور پولی تھین کے استعمال کے خلاف قوانین بنانے اور ان پر سختی سے عملدرآمد

کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اس موذی اور ضرر رساں شے کے خلاف جہاں حکومت کو اپنے فرائض نبھانا ہوں گے، وہیں عوامی سطح پر بھی رضاکار تنظیموں کو بھی چاہئے کہ اپنے ارد گرد سے اس نقصان دہ عادت کو ختم کرانے میں اپنا بھرپور تعاون شامل کریں۔ پاکستان بھر میں قائم تقریباً 8 ہزار یونٹس میں سالانہ 55 ارب پولی تھین بیگ تیار کرتے ہیں۔ پنجاب حکومت پولی تھین کے شاپر بیگ بنانے والوں کے خلاف کریک ڈاؤن جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہماری حکومت اور ضلعی انتظامیہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ پلاسٹک کے شاپنگ بیگز ہی ہمارے سیوریج سسٹم کی ناکامی کے ذمہ دار ہیں۔ جس کی روک تھام کیلئے پنجاب حکومت صوبے بھر میں بلا امتیاز کارروائیاں کر رہی ہے محکمہ تحفظ ماحول پنجاب نے صوبے بھر میں عوام کو پولی تھین بیگز کے استعمال سے پیدا ہونے والے اثرات سے بچاؤ کے لیے جاری آپریشن کے دوران 1674 ایسے مقامات کے دورے کیے جہاں غیر قانونی پلاسٹک بیگز تیار ہو رہے تھے۔ خلاف ورزی کے مرتکب 317 یونٹس میں سے 257 یونٹس کے خلاف چالان کر کے مقدمات ماحولیاتی ٹریبونل کو برائے کارروائی بھیج دیئے گئے ہیں۔ وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کی خصوصی ہدایت پر پنجاب کو آلودگی سے پاک صوبہ بنانے کیلئے تمام اضلاع میں بلا امتیاز کارروائیاں جاری ہیں۔ حکومت پنجاب پولی تھین بیگز آرڈیننس 2002 کے تحت پہلے ہی ایسے پلاسٹک بیگز کی تیاری پر مکمل پابندی عائد کر چکی ہے۔ محکمہ ماحول کی خصوصی ٹیموں نے پنجاب کے مختلف اضلاع میں باقاعدگی سے مہم جاری رکھی ہوئی ہے جس کے دورس نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

پلاسٹک بیگز کی تیاری کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ پلاسٹک بیگ کی کمپنیوں پر پابندی عائد کر کے جو کہ پنجاب حکومت کر بھی رہی ہے اس سے جڑے لوگوں کے لئے متبادل ذریعہ معاش کا انتظام کیا جائے۔ دوکانوں کے لئے ضرورت کے مطابق حکومتی سرپرستی میں کپڑے کے تھیلے بنائے جائیں جبکہ سبزی فروٹ وغیرہ کی خریداری کے لئے نوکریوں کا استعمال عمل میں لایا جائے۔ پلاسٹک کے کم استعمال سے ماحول کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ماحولیاتی آلودگی، اسباب اور حل کے لیے عوامی سطح پر شعور و آگاہی کا انتظام کیا جائے۔ اس کے علاوہ ہر پلاسٹک بیگ کے استعمال پر ٹیکس لگایا جائے تاکہ پلاسٹک بیگز کے استعمال میں کمی لائی جاسکے۔



صوبائی وزیر تحفظ ماحول بیگم ذکیہ شاہنواز کا کہنا ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی میں پلاسٹک بیگ اگرچہ سہولت پیدا کر رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بیگز انسانی صحت اور ماحول کے لئے انتہائی مضر ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء میں پلاسٹک بیگز کا بڑھتا ہوا استعمال کینسر سمیت دیگر موذی امراض کا باعث بن رہا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر حکومت پنجاب ماحول کو آلودگی سے پاک رکھنے اور اپنی آئندہ نسلوں کو محفوظ ماحول فراہم کرنے کے لئے پولی تھین بیگز کی مینوفیکچرنگ کی روک تھام کے لئے سفیدہ اقدامات اٹھا رہی ہے۔ پنجاب کے تمام اضلاع میں روزانہ کی بنیاد پر تمام فیلڈ دفاتر میں پولی تھین بیگ بنانے والوں کے خلاف سخت کارروائی عمل میں لائی جا رہی ہے۔ جو آرڈیننس کی خلاف ورزی کے مرتکب پائے گئے، ان کے خلاف عدالتی کارروائی کی جا رہی ہے۔ ماحول کو آلودگی سے پاک رکھنے کے لئے سوشل میڈیا کے ذریعے بھی پولی تھین بیگز کے نقصانات اور ان کی تلافی سے متعلق احتیاطی تدابیر کی ترسیل کے ذریعے اہم کردار ادا کیا جا رہا ہے۔ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے ہمیں پلاسٹک بیگ کی بجائے کپڑے کے بیگ کے استعمال کے رجحان کو فروغ دینا ہے تاکہ ہم اپنے بچوں کو متوقع بیماریوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس ضمن میں این جی اوز کا کردار بھی قابل ذکر ہے۔

پرنسپل انوار مینٹل سائنس ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر سعید احمد قیصرانی کا کہنا ہے کہ پولی تھین بیگ یا لفافے وزن میں انتہائی ہلکے اور سستے ہوتے ہیں اور ہم انہیں کسی بھی طرح سے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان ہی فائدوں کو دیکھ کر ہم ان کا بکثرت استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کے مضر اثرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان پلاسٹک بیگز کو استعمال کے بعد پیچیدہ دیا جاتا ہے، لیکن یہ اپنی کیسادی خصوصیات کے باعث مٹی، پانی یا ہوا میں گلنے سڑنے کے بجائے ہمارے ماحول کے لئے مضر اور ضرر رساں بن جاتے ہیں۔ ادارہ صحت مند ماحول کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور آلودگی میں کمی کے لئے تعلیم و تحقیق کے ذریعے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ ہمارا ماحول عدم توبہی کے باعث انتہائی آلودہ ہو چکا ہے، جبکہ بے ہنگم ترقی اور اس کے ان دیکھے مضمرات بھی ہمارے ماحول کی آلودگی میں برابر کے ذمہ دار ہیں۔ کیسادی اشیاء کا لاپرواہی سے استعمال اور اس کے نتیجے میں غلاطیات کا پھیلنا، ہمارے ماحول کو آلودہ کرنے کا بڑا سبب ہے۔ ہماری لاپرواہی کے نتیجے میں پانی، ہوا، زمین اور اس پر بسنے والے چرند و پرند حیوانات اور انسان، یہاں تک کہ ہمارے درخت اور پودے بھی آلودگی کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہماری روزمرہ زندگی میں جتنی بھی غلاطیات اور گندگی دیکھنے میں آتی ہے اسے مضر صحت نہ بننے دینا ہی آج ہمارا سب سے اہم چیلنج ہے۔ جب تک ہم اپنے ارد گرد کے ماحول کو صحیح طور سے نہیں سمجھ پائیں گے، اسے آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک و صاف نہیں رکھ پائیں گے۔ ہم

جاتا اور لوگوں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ کپڑے اور کاغذ کے بیگز استعمال کریں اور ماحول کو صاف بنائیں۔

§§§

پندرہ مائیکرون سے کم وزن پلاسٹک بیگز تیار کئے جارہے تھے۔ نیز حکومت کی طرف سے کالے رنگ کے شاپر بیگز اور ایسے پولی تھین بیگز جنکی موٹائی 15 مائیکرون سے کم ہے انکی تیاری، فروخت، استعمال اور درآمد ممنوع قرار دی ہے کالے شاپر بیگز میں مضر صحت رنگ دیگر پولی تھین شاپر بیگز کی نسبت 2 سے 3 گنا زیادہ ہوتا ہے ان میں کھانے پینے کی گرم اشیاء کا استعمال صحت کیلئے انتہائی خطرناک ہے 15 مائیکرون سے کم موٹائی کے پولی تھین بیگز پر پابندی کی وجہ ضائع شدہ پولی تھین بیگز کی ری سائیکلنگ کو فروغ دینا ہے کیونکہ 15 مائیکرون سے کم موٹائی کے ضائع شدہ پولی تھین بیگز میں ان کے اپنے وزن سے زیادہ گردوغبار ہوتا ہے اور اس طرح نہ صرف اسکی ری سائیکلنگ مہنگی ہے بلکہ مشکل ہے اور ری سائیکلنگ سے وابستہ کمپنیاں اور افراد اسے نہیں خریدتے جسکی وجہ سے یہ گلیاں، بازاروں اور سالڈویٹ میں جمع ہو کر آلودگی کا باعث بنتے ہیں پولی تھین ویسٹ نے آلودگی کے ساتھ ساتھ شہروں کا جمالیاتی حسن بھی تباہ کرکھا ہے بلکہ سیوریج سسٹم کی تباہی اور اوورفلو کا باعث بھی ہیں کھلے عام پڑے پولی تھین بیگز بارش وغیرہ کا پانی سٹور کر کے ڈینگ کی مچھر کی افزائش کا باعث بھی بنتے ہیں نیز یہ فصلوں کی جڑوں کو نقصان پہنچاتے ہیں جن کی وجہ سے پیداوار میں کمی ہوتی ہے کئی ممالک میں ان کے استعمال پر پابندی عائد ہے مختلف ممالک میں ان کی وجہ سے سیوریج سسٹم کے مسائل انتہائی شدت اختیار کر گئے تھے جس کی وجہ سے وہاں پر ان کے استعمال پر پابندی عائد کی گئی وہاں عوام پٹ سن کے تحیلے استعمال کرتے ہیں۔ آلودگی سے پاک ماحول کی فراہمی کیلئے ضروری ہے کہ پولی تھین بیگز کے استعمال کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی جائے، خصوصاً کالے پولی تھین بیگز کا استعمال تو فوری طور پر ترک کیا جائے۔ نیز ہم سب کی ذمہ داری ہے پلاسٹک کی بجائے کپڑے کے تحیلے استعمال کریں اگر اس پر کنٹرول نہ کیا گیا تو ماحول کو آلودہ ہونے اور فصلات کو تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ فصلات کے تباہ ہونے کا مطلب غذائی قلت کا سامنا یقینی ہے اسی طرح پولی تھین بیگز کی وجہ سے جہاں سیوریج سسٹم متاثر ہو رہا ہے وہیں ہمیں صاف پانی کی قلت بھی نظر آرہی ہے۔ اس کے حوالے سے محکمہ دو طرح سے اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے، اول، 2002 آرڈیننس کے مطابق جو فیکٹری 15 مائیکرون سے کم موٹائی کے پولی تھین بیگز تیار کرتی اس کے خلاف کریک ڈاؤن کیا جاتا ہے۔ ہمارے محکمے کی کارروائی کے نتیجہ میں اس وقت متعدد کیسز عدالت میں چل رہے ہیں اور قانون یہ ہے کہ کالے اور 15 مائیکرون سے کم موٹائی والے شاپنگ بیگز کی تیاری، فروخت، استعمال اور درآمد ممنوع اور قانوناً جرم ہے، اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو 50 ہزار روپے جرمانہ اور 3 ماہ قید یا دونوں سزائیں اکٹھی ہو سکتی ہیں اور دوسرا بینرز اور سوشل میڈیا کے ذریعے اس کے استعمال سے منع کیا

جس ماحول میں سانس لیتے ہیں، جب تک اسی ماحول کو ان تمام اشیاء اور آلاتوں سے پاک نہیں رکھیں گے جو کثافت پھیلانے کی ذمہ دار ہیں، تب تک ہمارا دم گھٹتا ہی جائے گا اور ہمارے لئے سانس لینا بھی دشوار بن جائے گا۔ آلودگی سے پاک ماحول کی فراہمی کے لئے ضروری ہے کہ پولی تھین بیگز کے استعمال کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی جائے، خصوصاً کالے پولی تھین بیگز کا استعمال تو فوری طور پر ترک کیا جائے، جس سے نہ صرف سیوریج نظام بری طرح متاثر ہوتا ہے، بلکہ ہوا کے دوش پر اثری ہوئی تھیلیاں شہر کی خوبصورتی کو متاثر کرتی ہیں۔ ان پولی تھین بیگز کے استعمال کی بجائے کپڑے یا کاغذ کی تھیلیاں استعمال کرنے کا عوام میں شعور بیدار کیا جائے، اس سلسلے میں شہری اور غیر سرکاری تنظیمیں اپنی قومی ذمہ داری کے لئے کردار ادا کریں۔

جزل امراض ماہر ڈاکٹر جاوید اقبال کا کہنا ہے کہ پولی تھین بیگز مضر صحت ہونے کے باوجود اسکا استعمال عام ہے جو باعث تشویش ہے، اس کے برے اثرات ہماری صحت کو متاثر کر رہے ہیں۔ اگر پولی تھین بیگز کو جلایا جائے تو ان کا دھواں ہوا کو زہر آلودہ کر دیتا ہے۔ جس سے نہ صرف سانس کی بیماریاں پھیل رہی ہیں بلکہ اسکے دھوئیں سے لوگوں کو کینسر کا مرض بھی لاحق ہو رہا ہے جو ہماری آنکھوں، جلد اور نظام تنفس پر بری طرح سے اثر انداز ہوتا ہے اور یہی دھواں سردرد کا موجب بھی بنتا ہے جو کہ جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ کھانے پینے کی اشیاء کی ترسیل کے لیے پلاسٹک بیگز کی حوصلہ شکنی کرنے کی ضرورت ہے نیز پولی تھین کا بے دریغ استعمال خواتین میں بڑھتے ہوئے بریسٹ کینسر کی اہم وجہ ہے اس لیے اس کے استعمال کو ترک کرنا ہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

محکمہ تحفظ ماحولیات کے ڈپٹی ڈائریکٹر انجم ریاض کا کہنا ہے کہ شہریوں میں اشیائے خوردونوش کو پولی تھین تھیلیوں میں بیک کرنے کا رجحان بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے جو انسانی و حیوانی حیات کیلئے زہر قاتل ہے، سڑکوں، گلیوں، نالیوں اور کھلی جگہوں پر پھینکے گئے پولی تھین بیگز سے ماحولیات آلودگی میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے، یہ بیگز استعمال کے بعد بھینکنے کے باوجود اپنی کیمیائی خصوصیات اور اثر رکھنے کی وجہ سے مٹی، پانی یا ہوا میں گلنے سڑنے کی بجائے ہمارے ماحول کو بری طرح آلودہ کر رہے ہیں، شہر میں سیوریج نظام کی تباہی اور آئے دن نالیوں اور گٹر کے بند ہونے کا ایک بڑا سبب پولی تھین بیگ ہیں، یہ شاپنگ بیگ ہمارے ماحول پر خطرناک حد تک منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں، حکومت کوشش کر رہی ہے کہ پولی تھین بیگز کے استعمال کی بجائے کپڑے یا کاغذ کی تھیلیاں استعمال کرنے کا شعور عوام میں بیدار کیا جائے، اس سلسلے میں محکمہ تحفظ ماحولیات اپنی ذمہ داری کیلئے اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ حال ہی میں ہمارے محکمہ نے بند روڈ کے علاقہ میں کارروائی کی جہاں بیگز فیکٹری میں

جنگلات کی معاشی ، ماحولیاتی

اہمیت !

مصنف: سفیان خان

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا کردہ عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت جنگلات بھی ہیں۔ اللہ نے اپنے بندوں کے لئے بنائی عالیشان جنتوں میں باغات اور نباتات کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔ لمبے اور گتے سائے والے درخت ، ان کے سائے اور ان سے پیدا ہونے پھولوں اور میوؤں کو اللہ نے جنت کی اعلیٰ ترین نعمتوں میں بیان کیا ہے ۔



پاکستان سمیت دنیا بھر میں ہر سال 21 مارچ کو جنگلات کا عالمی دن منایا جاتا ہے، جنگلات کی معاشی ، ماحولیاتی اور زریعہ اہمیت کا تعین کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی اسمبلی میں جنگلات کا عالمی دن منانے کی قرارداد پیش کی گئی اس دن کے منانے کا مقصد جنگلات کو ترقی دینا ۔ جنگلات اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد سے معاشرے میں شعور اجاگر کرنا ہے۔ جنگلات کے کٹاؤ سے ہونے والے نقصان کی آگاہی دینا ۔

گزشتہ چند سال میں جنگلات کا رقبہ ساٹھ فیصد سے کم ہو کر تیس فیصد رہ گیا ہے ۔ جنگلات کی روز بروز کمی کے باعث اوزون کی تہہ باریک ہوتی جارہی ہے اور زمین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے ۔ اس لئے جنگلات کے تحفظ کے لئے تحریکیں چلائی جارہی ہیں ۔ جنگلات نہ صرف انسانوں بلکہ چرند پرند اور جانوروں کی بقاء کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ ملک کی متوازن معیشت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تیس فیصد رقبے پر جنگلات ہوں۔ لیکن سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کے کل رقبے کا صرف لگ بھگ پانچ فیصد جنگلات پر مشتمل ہے ۔ جبکہ غیر سرکاری حلقوں کے مطابق پاکستان کے پاس صرف تین فیصد جنگلات باقی ہیں۔ ان میں سے بھی ہر سال قریباً آٹالیس ہزار ہیکٹر جنگل غائب ہو رہا ہے ۔ اس میں آگ، کیڑے کوڑوں اور نباتاتی بیماریوں کا تصور صرف چھ فیصد ہے ۔ بقیہ 94 فیصد جنگل کی صفائی کے ذمہ دار کمرشل اور نان کمرشل، قانونی

و غیر قانونی انسانی ہاتھ ہیں۔ اگرچہ حکومت اپنے اعداد و شمار کے ذریعے یہ ثابت کرنے پر مصر ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں جنگلات پر مبنی کل رقبہ چار اعشاریہ آٹھ سے بڑھ کر پانچ اعشاریہ صفر ایک فیصد ہو گیا ہے ۔

پاکستان میں دیگر مسائل کے علاوہ جنگلات کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے ۔ جنگلات کی کمی ہونے کی وجہ سے روز بروز آلودگی میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ تو دوسری طرف ٹمبر مافیا بھی اپنا کردار نبھانے میں سرگرم ہیں۔ جنگلات میں کمی کرنے میں ٹمبر مافیا خاطر خواہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ جنگلات کی قیمتی لکڑی کو مفت اور چوری کاٹ کر بازاروں میں جا بیچتے ہیں۔ ٹمبر مافیا کی ان حرکات کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑ رہا ہے ۔

لہذا اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ٹمبر مافیا کو روکنے کیلئے حکومت سخت قانون بنائے (قانون تو موجود ہیں ان کا نفاذ یقینی بنائے) جنگلات کسی بھی ملک کی معیشت کا لازمی جز ہیں۔ ملک کی متوازن معیشت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فیصد رقبے پر جنگلات ہوں۔ جنگلات قدرتی وسائل کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ پاکستان میں جنگلات کا کل رقبہ 42,240 کلومیٹر ہے جو کہ 05.31% بنتا ہے پاکستان میں جنگلات کا رقبہ اس لئے بھی کم ہو رہا ہے کہ یہاں پر جنگلات کو بے رحمانہ طریقے سے کاٹا جا رہا ہے ۔ مکانات کی تعمیر کے لئے جنگلات کی زمین کو استعمال کی جا رہا ہے اور پھر ہر سال دریا بھی کٹاؤ کا کام کر رہے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ جنگلات کے اگانے کے لئے مزید زمین مختص کی جائے اور درختوں کی غیر ضروری کٹائی کو بند کیا جائے ۔



جنگلات ملک کے اہم وسائل میں سے ایک ہیں اور یہ اس ملک کی عمارتی لکڑی اور جڑی بوٹیوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ جنگلات زمین کی زرخیزی قائم رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔ جنگلات درجہ حرارت کو اعتدال پر رکھتے ہیں اور اطراف کے موسم کو خاص طور پر خوشگوار بناتے ہیں۔ جنگلات سے حاصل شدہ جڑی بوٹیاں ادویات میں استعمال ہوتی ہیں۔ جنگلات جنگلی حیات کا ذریعہ اور سبب ہیں۔ بے شمار جنگلی جانور یعنی شیر، چیتا، اور ہرن وغیرہ جنگلات میں پائے جاتے ہیں۔ جنگلات جلائے

جانے والی لکڑی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ جنگلات زمین کے حسن و دلفریبی میں اضافہ کرتے ہیں۔ جنگلات بہت سے وسائل کا ذریعہ اور ماخذ ہیں۔ مثلاً جنگلات سے حاصل کردہ لکڑی فرنیچر، کاغذ، مچس اور کھیلوں کا سامان تیار کرنے میں استعمال ہوتی ہیں۔ جنگلات پہاڑوں پر جی ہوئی برف کو تیزی سے پگھلنے سے روکتے ہیں اور زمین کے کٹاؤ پر بھی قابو رکھتے ہیں۔

جنگلات انسانوں اور قدرتی نباتات کو تیز رفتار آندھیوں اور طوفان کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ جنگلات فضاء میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار کو بڑھنے نہیں دیتے کیوں کہ انہیں خود اس گیس کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ آکسیجن خارج کرتے ہیں جو انسانی زندگی کے لئے لازمی ہے ۔ بھیڑ، بکری، اونٹ جیسے حیوانات اور سینکڑوں جنگلی جانور اپنی غذا ان ہی جنگلات سے حاصل کرتے ہیں۔ جنگلات تفریحی مقامات کے کام آتے ہیں اور لوگ ان کے خوبصورت ، حسین مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جنگلات مختلف اقسام کے جانوروں اور پرندوں کی افزائش اور نشوونما کا ذریعہ بنتے ہیں انسان آج انہی درختوں کا سب سے بڑا دشمن بن چکا ہے ، جی ہاں، وہی درخت اپنے قاتل اسی انسان کی بے شمار ضروریات پورا کرتے ہیں۔ اگر ان نباتات کو زمین سے خارج کیا جائے و انسانی زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں ۔ یہی درخت جہاں ماحول کو خوبصورت بناتے ہیں، وہیں ہوا کو صاف رکھتے ، آندھی اور طوفانوں کا زور کم کرنے ، آبی کٹاؤ روکنے ، آکسیجن میں اضافے اور آب و ہوا کا توازن برقرار رکھنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی موجودہ دور کا ایک گمبھیر مسئلہ ہے تو درخت ہی اس پیچیدہ مسئلے کا ایک اچھا اور آسان ترین حل ہیں۔



اب ہمارے جنگلات صرف بمشکل تک 4 فیصد رہ گئے ہیں۔ اس کا خوفناک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے ملک میں اب وہ سلسلہ وار بارشیں بہت حد تک ختم ہو کر رہ گئی ہیں، جن پر ہماری زراعت کا سب سے زیادہ انحصار تھا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت نے دریائے راوی کا پانی مکمل بند کر دیا تو علاقہ بنجر ہو گیا ۔

حکومت کو بھارتی آبی دہشت گردی کے سدباب کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں ان مشتے جنگلات کو بچانے کی فوری تدبیر کرنی چاہیے ۔ پاکستانی قانون میں اگرچہ کاغذات کی حد تک جنگلات کے کٹاؤ کے خلاف پابندی بھی عائد ہے ، لیکن اس کی کسی کو پروا نہیں۔ اصل میں جنگلات کے کٹاؤ اور

ان درختوں کے جو نہروں، دریاؤں، سڑکوں کے کنارے لگائے جاتے تھے، وہ افراؤ ہی ملوث ہیں، جو ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، پاکستان کے جنگلات اور ملک کے باقی درختوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ وزیر اعظم جناب نواز شریف کے ساتھ چاروں وزرائے اعلیٰ سے عالمی یوم جنگلات کے موقع پر گزارش ہے کہ اس مسئلے کی بھی فوری نوٹس لیں۔ شجر کاری کی زیادہ سے زیادہ مہم چلائیں اس سلسلے میں عوام کو بھی بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔

§§§

شوگر مافیا کا عروج اور کپاس کا زوال

مصنف: علی احمد

سے کئی گنا آگے ہیں۔ کما کی فصل 12 سے 16 ماہ میں تیار ہوتی ہے اور اس کے لیے اوسطاً 78 انچ فی ایکڑ پانی درکار ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں دیگر مقامی فصلوں کے لیے پانی کی ضرورت کا جائزہ لیں تو کپاس اوسطاً 39 انچ فی ایکڑ، مکئی 35 انچ فی ایکڑ، گندم، جوار اور باجرہ 21 انچ فی ایکڑ پانی سے تیار ہوجاتی ہیں۔ اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ کما کی فصل کو باقی تمام فصلوں کی نسبت تین گنا زیادہ پانی کی ضرورت ہے لیکن اس کے باوجود ہر سال کما کے زیر کاشت رقبہ میں اضافہ کر کے ملک کو پانی کے بحران میں دھکیلنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اگر کما کے زیر کاشت رقبہ کو محدود کر دیا جائے تو جہاں کپاس کی پیداوار میں اضافہ ہوگا وہاں ایک کثیر رقبہ پر اس دورانہ میں گندم کی دو فصلیں کاشت کی جاسکتی ہیں جس کی وجہ سے پاکستان گندم میں خود کفیل ہوجائے گا۔

کسانوں کی کسمپرسی ملاحظہ کیجئے کہ چینی کی کم قیمتوں کی وجہ سے گئے کے کاشتکاروں کو اپنی فصل شوگر انڈسٹری کے صنعت کاروں کے رحم و کرم پر چھوڑنی پڑتی ہے۔ باثر افراد پر مشتمل شوگر ملز مافیا بیک وقت کم قیمت پر گنا خرید کر اور کسانوں کو منگنے داموں چینی فروخت کر کے ان کا استحصال کر رہا ہے۔ کسانوں کو گئے کی مناسب قیمت نہیں دی جاتی بلکہ معمولی قیمت کی ادائیگی کے لیے بھی میٹروں تک محروم رکھا جاتا ہے۔ شوگر ملز کروڑوں روپوں کی ناپائیدار ہیں کیوں کہ بیشتر شوگر ملیں حکمرانوں اور سیاسی راہنماؤں کی ذاتی ملکیت ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت پاکستان میں کل 85 شوگر ملز ہیں سے آدھی سیاستدانوں کی ملکیت ہیں۔ پنجاب میں شریف خاندان کی 9 شوگر ملز ہیں جبکہ سندھ میں چار شوگر ملز زرداری خاندان کی ملکیت ہیں اور ایک شوگر مل ذوالفقار مرزا کی ملکیت ہے۔ آئی ایس آئی کے سابق ڈی جی اختر عبدالرحمان کے دو صاحبزادوں ہارون اختر اور ہمایوں اختر کی دو شوگر ملز ہیں۔ تحریک انصاف کے مرکزی رہنما جہانگیر خان ترین کی دو شوگر ملز سابق چیئرمین پی سی بی ذکا شرف ایک شوگر مل کے مالک ہیں۔ سابق وفاقی وزیر عباس سرفراز خیبر پختونخوا میں موجود 8 میں سے 4 شوگر ملز کے مالک ہیں۔ اسی طرح اس کے علاوہ محرم احمد محمود، نصر اللہ دریشک، چوہدری شجاعت حسین، چوہدری پرویز الہی اور میاں اختر سمیت کئی سیاستدان اور خاندان شوگر ملز کے مالک ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ٹیکسٹائل ملز کی نسبت شوگر مافیا زیادہ طاقتور ہے اور کپاس کی کاشت کرنے کے بجائے کما کو ترجیح دیتے ہوئے ملکی معیشت کو تباہ کیا جا رہا ہے۔

موجودہ حالات میں کپاس کی پیداوار میں اضافہ کے لیے حکومت کو انقلابی اقدامات کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ کپاس کی پیداوار کے لیے موزوں علاقوں بالخصوص جنوبی پنجاب میں کما کی کاشت، شوگر ملز کی منتقلی اور نئی شوگر ملز لگانے پر پابندی عائد ہونی چاہیے۔ کما کی فصل کے طویل دورانہ اور پانی کی زیادہ ضرورت کی وجہ سے دنیا بھر میں چتندر کو چینی کے بہترین ذریعے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں خیبر پختونخوا، سندھ اور پنجاب کے کچھ اضلاع کی آب و ہوا چتندر کی کاشت کے لیے سازگار ہے۔ چتندر کی فصل جلد تیار ہوجاتی ہے اور پاکستان میں اس کی اوسط پیداوار بھی زیادہ ہے اس لیے اسے چینی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے چتندر کی کاشت کو کما کے متبادل کے طور پر فروغ دیا جانا چاہیے۔



کپاس ہمارے ملک کی ایک اہم نقد آور فصل ہے جس کا جی ڈی پی میں حصہ 1.7 فیصد ہے۔ ٹیکسٹائل کے شعبے میں کپاس کا مرکزی کردار ہے اور ٹیکسٹائل انڈسٹری نہ صرف ہمارے 66 فیصد برآمدات کا احاطہ کرتی ہے بلکہ 40 فیصد مزدوروں کو روزگار بھی فراہم کرتی ہے۔ ملکی آب و ہوا کپاس کے لیے سازگار ہونے کے باعث پاکستان عرصہ دراز سے کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا کے پانچ بڑے ممالک میں شامل رہا ہے لیکن گزشتہ پانچ سالوں میں کپاس کی پیداوار میں تشویشناک حد تک کمی نے ملکی معیشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ پاکستان میں گزشتہ برس کپاس کی فصل خاصی بہتر رہی اور 14.6 ملین گانٹھیں حاصل ہوئیں، لیکن مجموعی طور پر کپاس کی پیداوار میں 30 فیصد کمی واقع ہوئی جس کی وجہ سے ملکی معیشت کو 5 فیصد نقصان کا سامنا رہا۔ کپاس کی پیداوار تخمینہ سے کم ہونے کے باعث کپاس کے متوقع بحران سے نمٹنے کے لیے رواں سال 15 لاکھ گانٹھوں کے لگ بھگ بیرون ممالک سے روٹی کے درآمدی معاہدے کر لیے گئے ہیں۔ کپاس کی پیداوار میں عالمی شہرت کے حامل ملک کے لیے اربوں روپے کپاس کی درآمد پر خرچ کرنا حکومت کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

موسمی تغیرات اور ہر سال بیماریوں کے حملے کے علاوہ کپاس کے زیر کاشت رقبہ میں بندرتج ہونے والی کمی کپاس کی پیداوار میں کمی کی بڑی وجہ ہے۔ سینٹرل کاؤن ریسرچ انسٹیٹیوٹ ملتان کے مطابق حالیہ سیزن میں کپاس کے زیر کاشت رقبہ میں کمی کا بنیادی سبب گئے کے زیر کاشت رقبہ میں ہونے والا اضافہ ہے۔ ادارے کی طرف سے جاری کردہ رپورٹ کے مطابق گزشتہ سال صوبہ پنجاب میں 15 لاکھ ایکڑ رقبہ پر گئے کی فصل کاشت کی گئی تھی، جبکہ رواں سال گئے کا زیر کاشت رقبہ بڑھ کر 18 لاکھ ایکڑ ہو گیا ہے۔ گزشتہ سال کپاس کے زیر کاشت رقبہ میں پنجاب میں 21 فیصد کمی اور ملک بھر کے مجموعی زیر کاشت رقبہ میں 15 فیصد کمی ہو گئی جو کپاس کی پیداوار میں کمی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ملکی پیداوار کے لحاظ سے صوبہ پنجاب میں کپاس کی کاشت کا رقبہ 80 فیصد ہے۔ کپاس کی فصل پر کیڑوں کے حملے سے بچا کے لیے حکومت نے محکمہ زراعت کی ہدایت پر صوبہ پنجاب میں کپاس کی قبل از وقت بوائی پر دفعہ 144 نافذ کر دی ہے۔ اگیتی کاشت پر پابندی کی وجہ سے کاشتکار کپاس کی بوائی کے لیے 15 اپریل تک انتظار کرنے کے بجائے کما کی بوائی کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ کاشت کاروں کی ایک قابل ذکر تعداد اس حکومتی اقدام کو © "کاؤن بیلٹ" میں شوگر ملز لگانے والے مافیا کما کاشت کو فروغ دلوانے کی سازش قرار دے رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے کما کے بڑھتے ہوئے زیر کاشت رقبہ نے کپاس کی پیداوار کو شدید متاثر کیا ہے۔ کما گرم مرطوب علاقے کی فصل ہے اور پنجاب گرم خشک علاقہ ہے یہاں اوسط سالانہ بارش بھی کم ہوتی ہے۔ امریکہ کی سٹینفورڈ یونیورسٹی کے محققین کے مطابق جس خطہ میں کما کی فصل کاشت کی جائے وہاں درجہ حرارت کم اور آب و ہوا مرطوب ہوجاتی ہے۔ پاکستان میں کپاس کے کی کاشت کے لیے سازگار سمجھے جانے والے علاقوں میں کما کاشت کرنے کی وجہ سے فضا میں نمی کا تناسب بڑھ چکا ہے جس کی وجہ سے آب و ہوا گرم مرطوب ہو چکی ہے۔ چونکہ کپاس کی فصل کے لیے گرم خشک آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے اس فصل پر ہر سال انتہائی خطرناک بیماریوں کا حملہ معمول بن چکا ہے۔

کپاس کے پیداواری علاقوں میں کما کی کاشت کے فروغ کے لیے سرگرم عمل مافیا اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ پاکستان میں کما کی فی ایکڑ اوسط پیداوار 639 من ہے جو کہ دیگر ممالک سے کئی گنا کم ہے۔ مصر، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، انڈونیشیا اور ملائیشیا میں فی ایکڑ اوسط پیداوار 1800 من سے زائد ہے جبکہ ہمارے ہمسایہ ممالک چین، بھارت اور بنگلہ دیش بھی اس دوڑ میں ہم

اردو ادب کا ایک نام۔ ابن انشاء

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

یہ کالج نہیں بنجائے کا
تم ایک مجھے بہتری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

ابن انشاء 1962ء میں نیشنل بک کونسل کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ ٹیویو بک ڈسٹریبیوٹن پروگرام کے وائس چیرمین اور اسٹین کو پبلی کیشن پروگرام ٹیویو کی مرکزی مجلس ادارت کے رکن بھی مقرر ہوئے۔ 1969ء میں آپ نے دوسری شادی کی دوسری بیگم کا نام شکیلہ بیگم تھا۔ دوسری بیوی سے آپ کے دو بیٹے سعدی اور رومی پیدا ہوئے۔ کسی حد تک یہ پسند کی شادی تھی۔ ابن انشاء کی شاعری میں ایک جادو ہے۔ ان کی بات ہی الگ ہے۔ کیا کمال کا شاعر تھا اور کیا کمال کی شاعری ہے۔

دل جبر کے درد سے بوجھل ہے، اب آن ملو تو بہتر ہو
اس بات سے ہم کو کیا مطلب، یہ کیسے ہو، یہ کیونکر ہو
انشاء جی اب اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

ان کی چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔ آوارہ گرد کی ڈائری۔ دنیا گول ہے۔ ابن بطوطہ کے تعاقب میں۔ چلنے ہو تو چین کو چلئے۔ نگری نگری پھرا مسافر۔ آپ سے کیا پردہ۔ غمار گندم۔ اردو کی آخری کتاب۔ خط انشا جی کے۔ اس کے علاوہ آپ نے متعدد تراجم بھی کیے (اندھا کنواں اور دیگر پر اسرار کہانیاں۔ مجبور۔ لاکھوں کا شہر۔ شہر پناہ چینی نظمیں، سانس کی پھانس، وہ بیٹوی تصویر، عطر فروش دوشیزہ کے قتل کا معرہ، قصہ ایک کنوارے کا۔ کارناسے ناب تیس مار خان کے۔ شلجم کیسے اکھڑا بچوں کیلئے ایک پرانی روسی کہانی کا ترجمہ۔ یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟۔ قصہ دم کٹے چوہے کا۔ میں دوڑتا ہی دوڑتا۔ اختر کی یو میں، اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سندھی شاعری کا اردو ترجمہ بھی کرنے کا بھی اعزاز ابن انشاء نے ہی حاصل کیا۔

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو نظم کہنے کے ایک ماہ بعد ابن انشاء کی وفات ہوئی۔ اردو ادب کا یہ بے حد مقبول و اہم شاعر و ادیب، مزاح نگار، جس نے اپنی زندگی کے زیادہ تر ایام حالانکہ اپنے شہر کراچی، لاہور یعنی پاکستان میں گزارے، مگر جب اجل کا وقت قریب آیا تو وہ اپنے وطن سے سات سمندر پار انگلستان میں مقیم تھے۔ وہیں انہوں نے 11 جنوری 1978ء کو لندن میں وفات پائی اور پاپوش نگر قبرستان، کراچی میں آسودہ خاک ہیں۔ یہ عظیم شاعر و ادیب افسانہ نگار ابن انشاء جسمانی طور پر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس دنیا سے رخصت ہوئے 39 برس بیت گئے ہیں مگر وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ آج بھی زندہ ہے۔

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہر جانی ہے

اس شہر سے دور

اک کنیا ہم نے بنائی ہے

اس اس کنیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے

سب مایا ہے۔۔۔!!!

اردو ادب کے مایہ ناز شاعر، ادیب ابن انشاء کا اصلی نام شیر محمد خان تھا لیکن ابن انشاء کے نام سے مشہور ہوئے۔ 15 جون 1927ء کو چاندنہر کے ایک نوابی گاؤں کے راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی خان تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے سکول میں، مڈل نزدیکی گاؤں کے سکول سے اور 1941ء میں گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، میٹرک میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ابن انشاء کو صحافت، علم و ادب سے دلچسپی تھی، اس وقت "نوائے وقت" ہفت روزہ تھا، حمید نظامی صاحب سے خط و کتابت تھی، انہوں نے ایک خط میں حمید نظامی صاحب (مرحوم) سے لاہور آکر "نوائے وقت" میں ملازمت اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حمید نظامی کے مشورے پر ابن انشاء لاہور آ گئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا، ان کی رہائش کا بندوبست جناب حمید نظامی نے کیا مگر تین مہینے کے مختصر قیام کے بعد ابن انشاء اپنی طبیعت کے مطابق اور کچھ دیگر وجوہات کے سبب تعلیم اھوری چھوڑ کر لدھیانہ چلے گئے۔

وہاں بھی بھنورے نے کہاں رہنا تھا، لدھیانہ سے انبالہ چلے گئے، وہاں ملٹری اکیڈمی کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن جلد ہی یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور دلی چلے گئے۔ اس دوران میں آپ نے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ ابن انشاء ذہین تھے، تھوڑے عرصے بعد انہیں اسمبلی ہاؤس میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ بعد ازاں آل انڈیا ریڈیو کے نیوز سیکشن میں خبروں کے انگریزی رپورٹنگ کے اردو ترجمے پر مامور ہوئے اور قیام پاکستان تک وہ آل انڈیا ریڈیو ہی سے وابستہ رہے۔ آپ کی پہلی شادی 1941ء میں لدھیانہ میں عزیزہ بی بی سے ہوئی، عزیزہ بی بی سے ابن انشاء کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی، بعد ازاں گھریلو ناچاکی کے سبب دونوں کی طبیعت میں فرق کے سبب عزیزہ بی بی اور ابن انشاء میں علیحدگی ہو گئی، مگر طلاق نہ ہوئی، لہذا عزیزہ بی بی نے باقی تمام عمر ان کی بیوی کی حیثیت ہی سے زندگی بسر کی لیکن ان سے الگ رہیں۔

جب پاکستان بنا تو ابن انشاء اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور لاہور میں رہائش اختیار کر لی، انڈیا میں ریڈیو سے منسلک رہے تھے، اس لیے بھاگ دوڑ کر کے 1949ء میں وہ ریڈیو پاکستان کراچی کے نیوز سیکشن سے بطور مترجم منسلک ہوئے۔ کام کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا، اپنی اھوری تعلیم مکمل کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے اردو کالج کراچی میں 1951ء میں ایم اے اردو کی شام کی جماعتوں میں داخلہ لے لیا اور 1953ء میں ایم اے کا امتحان کیا پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کیلئے تحقیقی کام کرنے کا سوچا بھاگ دوڑ کر کے مارچ 1954ء میں بعنوان (اردو نظام کا تاریخی و تنقیدی جائزہ (آغاز تا حال) کا مقالہ ملا مگر وہ اپنے اس مقالے کو مکمل نہ کر سکے کچھ عرصہ کراچی میں گزارنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔ دور جدید کے مسائل سے بھی ابن انشاء آگاہ تھے، اس کے لیے کالم نگاری کا راستہ اختیار کیا۔ وہ مختلف اخباروں کے لیے بڑی پابندی سے کالم لکھا کرتے تھے اور اپنی بے باک رائے پیش کیا کرتے تھے۔ کالم نگاری آخری عمر تک جاری رہی۔

ابن انشاء نے 1960ء میں روزنامہ "مردوز" کراچی میں درویش دمشق کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا۔ 1965ء میں روزنامہ "انجام" کراچی اور 1966ء میں روزنامہ جنگ سے وابستہ گی اختیار کی جو ان کی وفات تک جاری رہی۔ دو شعری مجموعے، چاند نگر اور اس بستی کے کوچے میں 1976ء شائع ہو چکے ہیں۔ 1960ء میں چینی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ (چینی نظمیں) شائع ہوا۔

کیا جھگڑا سود خسارے کا

اپریل فول ، جھوٹ کا عالمی دن !

مصنف: اسد احمد

یکم اپریل کو جھوٹ کا دن منانے کے بارے میں مختلف قسم کے واقعات ملتے ہیں، جس سے علم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اپریل لاطینی زبان کے لفظ اپریلس یا اپراز سے ماخوذ ہے۔ مطلب ہے پھولوں کا کھلنا، قدیم رومی قوم موسم بہار کی آمد پر شراب کے دیوتا کی یا دیوی کی پرستش کرتی اور اسے خوش کرنے کے لئے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے، ترنگ میں آتے اور جھوٹ بولتے۔ آگے چل کر یہ دن اپریل فول کہلایا۔ اپریل فول 1508ء سے 1539ء تک صرف یورپ میں منایا جاتا تھا اور اٹھارویں صدی میں برطانیہ میں منانے لگے اور اب چند سالوں سے پوری دنیا میں جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔



اپریل فول کا تذکرہ سب سے پہلے ایک انگریزی اخبار ڈریک نیوز لیٹر سے ملتا ہے یکم اپریل 1846ء کو اپریل فول کے موقع پر یورپ میں جو واقعات رونما ہوئے ان میں سے ایک اہم اور مشہور واقعہ یہ ہے کہ 31 مارچ کو ایک انگریزی اخبار میں یہ خبر آئی کہ کل شہر کے زراعتی فارم پر گدھوں کی عام نمائش ہوگی اور میلہ ہو گا تو لوگ خوش و خرم وہاں جمع ہوئے اور نمائش کا انتظار کرنے لگے۔ جب لوگ انتظار کر کر کے تھک گئے تو پوچھنے پر بتایا گیا کہ جو لوگ نمائش دیکھنے آئے ہیں وہی گدھے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جن کو ہر سال 2 اپریل کی اخبارات میں دیکھا جا سکتا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس دن جھوٹ بول کر کیسے لوگوں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ اگر اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اپریل فول منانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات میں جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے، جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہے، یہ منافقت کی نشانی ہے، اور

اپریل فول میں تو ایک تو جھوٹ بولا جاتا ہے اوپر سے اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے۔ اس کی خوشی منائی جاتی ہے۔ اس رسم اپریل فول میں جھوٹ بولا جاتا ہے دوسروں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، دھوکہ دیا جاتا ہے، غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کی جاتی ہے، تکبر کیا جاتا ہے۔ جھوٹ بول کر دوسروں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سچ بولنا نیکی ہے اور نیکی جنت لے جاتی ہے اور جھوٹ بولنا گناہ ہے اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔ تیسری حدیث میں ہے کہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر حرام ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کے شراغیز ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کسی مسلمان بھائی کو حقیر جان لے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہیں ڈھاتا وہ اسے رسوا نہیں کرتا اور نہ وہ اسے حقیر جانتا ہے۔ اور یہ سب برائیاں ایک اپریل فول منانے میں موجود ہیں۔

اس دن کو منانے سے دشمنان اسلام کی خوشیوں میں شرکت کا گمان ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر انسان گناہ کبیرہ یعنی جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اب رہ گئی پاکستان معاشرے کی بات کہ اس میں اس جھوٹ کے عالمی دن کو کیوں منایا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ مختصر یہ کہ خوشی کے لیے، حالانکہ جھوٹ بول کر خوشی منانے کا کیا جواز ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں جھوٹ بول کر ہی خوشی منائی جاتی ہے، روزی روٹی کمائی جاتی ہے، کاروبار کیے جاتے ہیں سیاست و صحافت چمکانی جاتی ہے۔ دوسروں کو بے وقوف بنا کر ہم لذت حاصل کرتے ہیں، خوشی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بھی کہنا ہے کہ جھوٹ بولنا اب ہمارے معاشرے میں گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ صادق ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ مسلمان گناہ گار ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ہمارے سیاست دان روز بہ روز جھوٹ بولتے ہیں یعنی روز ہمارے ساتھ اپریل فول مناتے ہیں۔



اسی طرح ہمارے صحافی بھائی، انکر پرسن، کالم نویس، بھی ہر روز ہم عوام کے ساتھ اپریل فول مناتے ہیں، اس کو چھوڑیں عوام بھی جہاں جہاں بس چلتا ہے ایک دوسرے سے ہر روز اپریل فول مناتی ہے، عام آدمی بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ اب مجھے یاد نہیں ہے لیکن کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ پاکستان میں سب سے زیادہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔



جس نے یہ روپورٹ لکھی تھی اسے شاید علم نہیں تھا کہ پاکستانی جھوٹ بول کر خوش بھی ہوتے ہیں اس لیے پاکستانیوں کے لیے تو ہر دن ہی اپریل فول ہے۔ دو نمبر مال دے کر، زیادہ پیسے لے کر، ملاوٹ والی چیزیں بیچ کر، جھوٹے مقدمات بنا کر، ایک دوسرے سے ہر روز اپریل فول ہی مناتے ہیں۔

اس لیے یہ دن ان کو منانا چاہیے جہاں جھوٹ نہیں بولا جاتا چلو ایک دن جھوٹ بول کر دل پشوری کر لیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جن کی نقل میں ہم اپریل فول مناتے ہیں وہ کم جھوٹ بولتے ہیں۔ پاکستان میں تو اس دن کو منانا اس دن کی توہین ہے۔ کیونکہ یہاں تو ہر روز منایا جاتا ہے، سب سے منایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب خصوصاً اہل یورپ افراط معاشرہ کے ساتھ عملی مذاق اور دوسروں کو بے وقوف بنانے کی غرض سے ایک مخصوص دن میں یہ تہوار مناتے ہیں۔ جھوٹ کے دن پورا بیچ! یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر روز یہ دن منایا جاتا ہے۔

ہم بات کر رہے تھے کہ پاکستانی معاشرے کی اس میں اس جھوٹ کے عالمی دن کو کیوں منایا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اوپر لکھی ہے عارضی خوشی حاصل کرنے کے لیے اس کے علاوہ دوسروں کو حقیر جانا بھی اس کی ایک وجہ ہے۔ اپریل فول میں ایسے کام کیے جاتے ہیں جن میں انہیں حقیر جانا گیا ہے بلکہ انہیں حقیر سمجھنا ہی ان سے مذاق کرنے پر ابھارتا ہے لوگوں کو احق قرار دینا۔ ہم خود دوسروں سے اعلیٰ خیال کرتے ہیں۔

اس خامی سے کم ہی بچے ہوں گے ہمارے سیاست دان، صحافت، اور عام آدمی بھی دوسروں کو گھٹیا ہی خیال کرتا ہے جیسے جھوٹ نے ہمارے معاشروں کو برباد کر دیا ہے ایسے ہی تکبر ہے اور اس رسم اپریل فول میں یہ دونوں برائیاں پائی جاتی ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ اپریل فول منانے کی وہاں دیگر بہت سی دباؤں کی طرح پھیلتی جا رہی ہے ہمارے نوجوانوں کی اکثریت اسے بغیر سوچے سمجھے قبول کر رہی ہے، اس کی ایک وجہ مغرب کی پیروی بھی ہے کیونکہ ہمارے نوجوانوں کی اکثریت

مغرب سے متاثر ہے، ہمارے نوجوان خود کو جدت پسند کہلانے کے لیے بھی یہ دن منا رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے نوجوان سچین میں مسلمانوں کے قتل عام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام والے واقعہ کی یاد میں یہ دن نہیں مناتی۔

ہمارے ذرائع ابلاغ سے اگر مناسب طریقے سے عوام کے لیے آگاہی مہم چلائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان سے اس رسم بد کا خاتمہ نہ کیا جاسکے آخر میں قرآن پاک کی سورۃ الحجرات کی ایک آیت کا مفہوم۔ اے ایمان والوں کوئی قوم کسی کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ (جن کا مذاق اڑایا جاتا ہے) ان سے بہتر ہوں، نہ عورتیں ہی دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ، نہ کسی کو برے لقب دو اسلام لانے کے بعد فسق بہت ہی برا نام ہے جس نے توبہ نہ کی وہی ظالم لوگ ہیں۔

§§§

